بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

جس طرح ترنگ کے عالم میں کیا ہوا کسی فرد کا ایک عمل یا لاشعوری کے عالم میں اُس کی زبان سے نکلا ہوا ایک جملہ اُس کے افکار و نظریات کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتا بالکل اسی طرح کسی نظامِ حیات کا کوئی دُور دراز کا مختصر سا گوشہ اُس کے خط و خال کو پوری طرح نمایاں نہیں کر سکتا۔ انسان کو اگر صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اس کے مزاج کا جاننا ضروری ہے تو کسی نظامِ حیات سے متعلق بھی صحیح واقفیت حاصل کرنے کے لیے اُس کے مزاج کو سمجھنا لابدی ہے۔ مختلف نظامہائے حیات کی قدر و قیمت کو صحیح طور پر متعین کرنے میں انسان نے جو ٹھوکریں کھائی ہیں اُن کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ وہ اُن کے ایک آدھ پہلو کو سامنے رکھ کر اُن کے بارے میں غلط اندازے کر لیتا ہے اور اُس روح اور اُس مزاج کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا جس کی وہ پہلو نمائندگی کرتا ہے۔

آپ اسلام، اشتراکیت اور سرمایہ داری ان تینوں نظاموں کا اگر سرسری سا جائزہ لیں تو آپ کو ان میں کئی ایک چیزیں مشترک نظر آئیں گی۔ مثلاً اسلام فرد کی آزادی کا علمبردار ہے اور سرمایہ داری بھی اسی اصول کی دعویدار ہے۔ اسی طرح اسلام انسان اور انسان کے درمیان مساوات کا قائل ہے اور اشتراکیت بھی اسی نظریہ کے حق میں ہے لیکن اشتراک کے ان خارجی مظاہر کے پسِ پردہ جب ہم جھانک کر دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض فریب نظر ہے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت میں تو ممکن ہے بعض پہلوؤں میں اختلاف ہونے کے باوجود اتحاد و اتفاق ہو مگر جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ نظامِ زندگی اپنی اساس اپنے

مزاج، اپنے خوب و ناخوب کے پیمانوں، اپنے مقاصد اور منہاج، الغرض رُوح سے لے کر فکر و عمل کی معمولی سے معمولی جزئیات تک زندگی کے ان تمام نظاموں سے یکسر مختلف ہے جن کی بنیاد مادیت پر رکھی گئی خواہ وہ اشتراکیت ہو یا سرمایہ داری یا کوئی اور نظام۔

اسلام میں کسی شے یا فعل کے اچھے یا بُرے ہونے کا واحد معیار اُس کا اخلاقی فائدہ اور نقصان ہے اور اسی معیار کے مطابق اُس کی اہمیت متعین ہوتی ہے۔ چونکہ انسان افعال و اعمال کے اخلاقی اثرات و نتائج کا جو بڑے گہرے بھی ہوتے ہیں اور دُور رس بھی، خود پُوری طرح اندازہ کرنے سے قاصر ہے اس لیے ان کی اخلاقی جانچ اور پرکھ کے لیے اُسے لازمی طور پر اُس ذات کی طرف رجُوع کرنا پڑتا ہے جو اس پُوری کائنات کی خالق اور مالک ہونے کی وجہ سے افعال و اعمال کے محسوس اور غیر محسوس مرئی اور غیر مرئی اثرات پر نہ صرف پُوری نظر رکھتی ہے بلکہ ان کی صحیح قدر و قیمت بھی متعین کر سکتی ہے۔

اسلام کے برعکس اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں میں انسان خود کسی چیز یا عمل کے اچھے اور بُرے پہلو متعین کرتا ہے اور خود اُس کی افادیت یا ضرر رسانی کا اندازہ کرتا ہے اس لیے وہ اس کے اُن اخلاقی پہلوؤں کی اہمیت سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہتا ہے جو خالق کائنات کے سامنے ہوتے ہیں۔

دنیا کی جو قومیں بھی ان نظاموں کی لپیٹ میں آئیں انہیں مجبوراً اس نظام کے تحت زندگی گزارنا پڑی جس کا رہنما اصول یہ تھا کہ کسی شے یا عمل میں جو کچھ خیر اور بھلائی ہے وہ اسی نقطۂ نظر سے ہے کہ مادّی اعتبار سے وہ کس قدر مفید اور کارآمد ہے۔ اور یہ وہ اصول ہے جس میں اشتراکیت اور سرمایہ داری ایک دوسرے سے پُوری طرح متفق اور متحد ہیں۔

اشتراکیت کے علمبردار سرمایہ داری کے خلاف مختلف باتیں کر کے لوگوں کو یہ باور کروانا چاہتے ہیں کہ ان کے مقاصد ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر یہ محض فریب نظر ہے۔ ان کے اندر جو کچھ اختلاف ہے وہ طرزِ عمل اور طریق کار کا ہے جہاں تک دونوں کے بنیادی مقاصد کا تعلق ہے اُن میں قطعاً کوئی اختلاف

نہیں کیونکہ دونوں مادّی سُود و زیاں کو کسی چیز کے حلال و حرام اور کسی فعل کے جائز و ناجائز ہونے کا واحد معیار قرار دیتے ہیں۔

چین کے اندر اشتراکی تجربے کے بارے میں لوگوں کو کتنی خوش فہمیاں تھیں۔ اس انقلاب کے داعی دنیا کو یہ تاثر دینے کی برابر کوشش کر رہے ہیں کہ مذہب کے معاملے میں روس نے جو عاقبت نا اندیشانہ روش اختیار کی تھی ہم اُس سے ہمیشہ اعراض کریں گے اور لوگوں کو یہ آزادی دیں گے کہ وہ اپنے مذہبی امُور کو جس طرح چاہیں طے کریں اور مذہب نے اُن پر جو ذمّہ داریاں ڈالی ہیں انہیں اپنے ذوق کے مطابق پُورا کریں۔ چنانچہ ایک وسیع پراپیگنڈے کے ذریعہ دنیا کی مذہب پسند قوموں خصوصاً مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کے لیے پُوری تگ و دو کی جا رہی ہے کہ اشتراکیت کا جو نسخہ اہلِ چین نے تیار کیا ہے وہ مذہب کے لیے کسی اعتبار سے بھی زہر نہیں بلکہ قند ہے اور مسلمانوں کو بڑی رغبت کے ساتھ اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔

پروپیگنڈے کی اس فضا میں جب ہر طرف چینی اشتراکیت کے حق میں نعرے بلند ہو رہے ہوں اور خود اہلِ چین ایک نئے تصورِ حیات کو دیانتداری کے ساتھ اپنا کر دنیا کی ایک بہت بڑی قوت بنتے جا رہے ہوں اس انقلاب کے علمبرداروں کے کسی دعوے کی تردید کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے مگر جوش و خروش کے اس عالم میں بھی جب ہر طرف چین کی مدح سرائی ہو رہی ہے اور لوگوں کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ یہ سرزمین ہر قسم کے ظلم و جور سے پاک ہے، یہاں کسی قسم کے استحصال کا نام و نشان نہیں، یہاں ہر فرد اور گروہ کے حقوق پُوری طرح محفوظ ہیں کبھی کبھی ایسی خبریں اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ چین کے اشتراکی وسیع النظری اور احترامِ انسانیت کے بلند بانگ دعووں کے باوجود کسی ایسے نظامِ حیات کا وجود گوارا نہیں کر سکتے جو خیر و شر کا معیار مادّی نفع و نقصان کی بجائے اخلاق و روحانیت کو بنائے۔ چنانچہ کویت کے مشہور مجلّہ "الوعی الاسلامی" نے سُرخ ثقافتی انقلاب کا جاری کردہ وہ اعلان شائع کیا ہے جس میں مسلمانوں اور ان کے عقائد کے بارے میں پالیسی کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ اعلان ملّت کے ہر اُس فرزند کے پیشِ نظر رہنا چاہیے جو ملّت سے کچھ بھی وابستگی رکھتا ہے۔

"اے سرخ فوج کے سپاہیو! تمہیں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ وہ لوگ جنہوں نے ہمارے خون بہائے، ہمارے گوشت نوچے اور ہماری ہڈیاں چبائیں، اب وقت آگیا ہے کہ ہم اُن کے خون بہائیں اور اُن کے گوشت نوچیں۔ اے سُرخ فوج کے سپاہیو! یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنے دشمنوں کو بھاگنے دیں۔ آج کے بعد ہم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اپنے دشمنوں پر خصوصاً چھپے ہوئے دشمنوں پر یعنی مسلمانوں پر پُوری قوت کے ساتھ جھپٹیں۔ کیونکہ یہ لوگ دین کے پردے میں ہماری جماعت اور ہمارے ملک کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے مساجد اور درس گاہوں کے اندر گھس کر اس استعمار کی چاکری کی ہے جو ہمارے ملک، ہماری تنظیم اور ہمارے قائد ماوزے تنگ کے خلاف صف آرا رہا ہے۔"

پھر مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ کہا جاتا ہے:

"اے مسلمانو! گوشِ ہوش سے سُن لو! آج کے بعد تمہیں اس بات کی ہرگز ہرگز اجازت نہ دی جائے گی کہ تم اپنے چہروں پر دین کا نقاب ڈال سکو ورنہ ہم تمہیں جلا وطن کر دیں گے یا نیست و نابود کر دیں گے۔ آج کے بعد تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ تم گائے کا گوشت کھاؤ کیونکہ گائے اس ملک میں اشتراکیت کے لیے مفید ہے۔ اب تمہیں خنزیر کا گوشت کھانا چاہیے۔ آج کے بعد تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ تم اپنے اوقات نمازوں میں ضائع کرو اور تم عربی زبان میں گفتگو کرو، وہ زبان جو چینی زبان سے مختلف ہے۔ تمہیں اس بات کی بھی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ قرآنِ کی تلاوت کرو جسے تم کتابِ مقدس کہتے ہو۔

اَے مسلمانو! پُورے غور سے سُن لو! تمہیں اپنے مدارس اور مساجد کو ڈھانا ہوگا، اپنی اسلامی تنظیمات کو توڑنا ہوگا، قرآن مجید کو جلانا ہوگا۔ رشتہ مناکحت کے جو اصول تم نے وضع کر رکھے ہیں انہیں ختم کرنا ہوگا، نماز کو خیر باد اور ختنے سے اجتناب کرنا ہوگا۔ تمہیں اب ماوزے تنگ کے افکار و نظریات کو اپنانا ہوگا اور اگر تم ان چیزوں سے باز نہ آئے تو پھر تمہیں مٹا دیا جائے گا۔ ہم

پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم دینی چوہوں کے سارے بلوں کو ملیا میٹ کر دیں۔ اور اگر تم اپنی روش سے باز نہ آئے تو تمہیں بھی ان کے ساتھ ہی برباد کر دیں۔ عظیم ثقافتی انقلاب زندہ باد! پائندہ باد!

ہمیں معلوم ہے کہ اشتراکیت کے حامی اپنے عام قاعدے کے مطابق اس اعلان کو بھی استعمار کا غلط پراپیگنڈا کہہ کر فریب خوردہ مسلمانوں کے حسنِ ظن کو قائم رکھنے کی کوشش کریں گے مگر جو شخص اشتراکیت کے مزاج سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے وہ اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ اس اعلان میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں جسے اَن ہونی کہا جا سکے۔ یہ اعلان اشتراکیت کے تقاضوں کے بالکل عین مطابق ہے بلکہ اگر اس سے کوئی مختلف بات کی جاتی تو ہمیں اُس پر حیرت ہوتی۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ مسلمان جس نظریۂ حیات کے علمبردار ہیں وہ اشتراکیت سے ہر مرحلے پر متصادم ہے اور وہ مسلمان رہ کر کبھی بھی کسی ایسے نظامِ زندگی کو اپنا نہیں سکتے جو مادی اقدار پر قائم کیا گیا ہو۔ انہیں اشتراکیت اور اسلام میں سے بہرحال ایک کو منتخب کرنا ہوگا۔ اگر وہ اشتراکیت کے اپنانے میں مخلص ہیں تو پھر اسلام سے ان کی محبت کا دعویٰ بالکل جھوٹا ہے اگر وہ اسلام سے سچی وابستگی رکھتے ہیں تو پھر اشتراکیت سے اُن کا تعلق بالکل فضول اور لغو چیز ہے۔ اس بنا پر اشتراکیت کے داعیوں نے بالکل صحیح کہا ہے کہ وہ اپنے متعلق فیصلہ کر لیں کہ وہ کس نظام سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں۔

دوسرے اب اگر انہیں چین میں زندگی گزارنا ہے تو پھر انہیں اپنے نقطۂ نظر میں بنیادی تبدیلی کرنا چاہیے اور حرام و حلال اور جائز و ناجائز کے اسلامی تصورات کو ختم کر کے ان تصورات کو اپنانا چاہیے جو اشتراکیت نے انہیں دیئے ہیں۔ گائے ملکی معیشت کے لیے خنزیر سے زیادہ مفید ہے اس لیے گائے کے گوشت کے استعمال سے دستکش رہ کر سؤر کا گوشت استعمال کرنا چاہیے۔

نماز دینی اور روحانی اعتبار سے خواہ کتنی ہی ضروری عبادت ہو اور اس کے ادا نہ کرنے سے اللہ کے بندوں کو خواہ کتنا نقصان پہنچتا ہو لیکن انہیں اسے ترک کر دینا چاہیے کیونکہ اس کے ادا کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے وہ مادی لحاظ سے نتیجہ خیز نظر نہیں آتا اس لیے اشتراکی نظام میں اس عمل کو قطعاً برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا خاتمہ تو اوّل روز ہی سے ہو جانا چاہیے تھا لیکن اگر اسے کچھ مدت تک بعض مصالح کے

کے تحت گوارا کیا جاتا رہا ہے تو اب اسے لازمی طور پر ختم کر دینا چاہیے ۔

یہی حال قرآن مجید کا ہے ۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اخلاق اور روحانیت کو انسانی افعال و اعمال کی بنیاد بنانے کی دعوت دیتی ہے اور یہ چیز اشتراکیت کے اساسی تصورات کی ضد ہے لہٰذا جب تک مسلمان اس کتاب اور اس کی مقدس تعلیمات کو چھوڑ کر مارکس ، لینن اور ماؤزے تنگ کی تعلیمات کو نہیں اپنالتے اس وقت تک وہ چین کے سچے خیر خواہ نہیں قرار دیئے جا سکتے ۔ اشتراکیت کے ساتھ ان کے اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نہ صرف قرآن کو پسِ پشت ڈال کر ماؤزے تنگ کی تعلیمات پر ایمان لائیں بلکہ قرآن مجید نے اوامر و نواہی کا جو نظام دیا ہے اُس کی دل و جان سے تکذیب کریں ، ان اخلاقی پابندیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کریں جو اسلام نے زندگی کے مختلف شعبوں میں عائد کر رکھی ہیں ۔

فکر و نگاہ کی اس ہمہ گیر تبدیلی کا تقاضا صرف اشتراکیت ہی نہیں کرتی بلکہ دنیا کا ہر وہ نظام کرتا ہے جو انسانی فکر و عمل کی اپنی کوئی الگ اساس رکھتا ہو ۔ یہ بات البتہ درست ہے کہ کوئی نظام یہ تبدیلی قوت کے زور سے لاتا ہے اور کوئی حالات کے دباؤ سے انسان کے افکار و نظریات اور احساسات و جذبات بدل کر رکھ دیتا ہے ۔ سرمایہ داری نے اشتراکیت کے برعکس دوسری راہ اختیار کی ہے ۔ منزل دونوں کی ایک ہے مگر راہیں مختلف ۔ سرمایہ داری کا طریقِ کار یہ ہے کہ لوگوں کے دین و ایمان سے براہِ راست تعارض نہ کیا جائے اور نہ انہیں مذہب اور دین کو ترک کرنے کی دعوت دی جائے مگر اجتماعی زندگی کو خالص الحاد کی بنیادوں پر تعمیر کر کے ایک انسان کے لیے مذہب کی پیروی قریب قریب ناممکن بنا دی جائے اور پھر تعلیم اور نشر و اشاعت کے ذریعہ اُسے اس بات کا قائل کیا جائے کہ وہ مذہب کے جن افکار و نظریات کو سینے سے لگائے ہوئے ہے وہ بالکل بوسیدہ اور ناکارہ ہیں ۔ راہوارِ زمانہ نے انہیں گرد سمجھ کر پیچھے پھینک دیا ہے اس لیے اس کا اب انہیں اپنانے پر بضد ہونا بالکل حماقت ہے جس کی عقل ، تجربہ اور مشاہدہ کوئی بھی تصدیق نہیں کرتا ۔ مسلمان یا دنیا کی دوسری مذہب پسند قومیں خواہ دین کو اشتراکیت کی جکڑ بندیوں اور ہمہ مقتدر ریاست کی قوتِ قاہرہ سے خوفزدہ ہو کر ترک کریں یا سرمایہ دارانہ فریب کاریوں کے زیرِ اثر آ کر پسِ پشت ڈالیں

مگر نتائج کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اشتراکیت میں قانون کا دباؤ لوگوں کو دین سے منحرف کر کے ان کی زندگی خالص مادہ پرستانہ بنیادوں پر تعمیر کرتا ہے اور سرمایہ داری میں وقت کے تقاضوں کی آڑ لے کر لوگوں کے ایمان سلب کیے جاتے ہیں اور اس کی جگہ الحاد کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ آپ اگر مذہب سے انحراف کی پوری تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو یہی دو رجحانات کسی نہ کسی صورت میں نظر آئیں گے۔

ان دو رجحانات کا بھی جب ہم مزید تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کے مظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک ہی تحریک کے دو رُخ ہیں اور وہ تحریک یہ ہے کہ کسی شے اور فعل کے محمود و مذموم، حق اور باطل یا حلال و حرام کا فیصلہ اُس کے مادی فوائد اور نقصانات کے مطابق کیا جائے۔ اگر کفر ایک ملت ہے تو کافرانہ افکار و نظریات بھی اپنے وسیع تر اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر ایک ہیں کیونکہ یہ سب ایک ہی چشمہ سے پھوٹتے اور غذا حاصل کرتے ہیں۔ جس اصول کو مارکس تاریخ کی مادی تعبیر کہتا ہے وہ دراصل یہی ہے کہ انسانی افعال و اعمال کا منبع و ماخذ صرف مادی اسباب و محرکات کو قرار دیا جائے اور پھر ان کے مطابق انسانی جدوجہد کی پوری تاریخ کی تعبیر کی جاتے۔

سرمایہ داروں نے اس تحریک کو کئی ایک ناموں سے موسوم کیا ہے مثلاً عقلیت پرستی، افادیت پسندی یا مادیت۔ ان سب میں بظاہر اختلافات کے کئی ایک پہلو ہیں لیکن آپ ان کی جڑوں میں اُتر کر دیکھیں تو آپ پر یہ حقیقت خود بخود منکشف ہو جائے گی کہ وہ سب کی سب ایک ہی زمین سے خوراک اور توانائی حاصل کرتی ہیں۔

یہ سب تحریکات انسانی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہو کر ایک جیسے نتائج مرتب کرتی ہیں یہ ایک دلچسپ بحث ہے جسے ان صفحات میں پوری طرح سمیٹا نہیں جا سکتا۔ میں صرف اس کی چند ایک مثالیں پیش کرتا ہوں۔

یورپ میں جس تحریک کو اصلاحِ مذہب کہا جاتا ہے وہ درحقیقت تجدید مذہب کی کوئی تحریک نہ تھی بلکہ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ انسانی افعال و اعمال کی روحانی اور اخلاقی بنیادوں کو منہدم کر کے انہیں مادی بنیادوں پر استوار کیا جاتے۔ یہ تحریک مذہب کے خلاف گہری سازش تھی جس نے بڑی فریب کاری کے ساتھ

اس مقصد کو حاصل کیا۔ سب سے پہلے انسان کے ذہن میں یہ بات بٹھائی گئی کہ مذہبی تعلیمات عقل کے عین مطابق ہونی چاہییں مگر عقل کے بارے میں یہ طے کر لیا گیا کہ جو چیز تجربہ اور مشاہدہ میں آکر مفید ثابت ہو جائے وہ عقل کے مطابق ہے۔ پھر افادیت کا معیار یہ قائم کیا گیا کہ وہ چیز مادی نقطۂ نظر سے فائدہ مند ہو۔ اس طرح چند سالوں میں صحیح مذہب کی جان پہچان یہ ہوگئی کہ اُس کی تعلیمات انسانوں کے لیے مادی نقطۂ نظر سے کارآمد ہوں اور جو اصول بھی اس راستے میں حائل ہوتا ہو وہ کم عقلی بلکہ جہالت ہے جس سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔

صنعتی انقلاب کے بعد یورپ کی قوموں کو سرمایہ کی ایک کثیر مقدار درکار تھی اور اپنے مال کی کھپت کے لیے اور خام پیداوار کے حصول کے لیے منڈیوں کی تلاش بھی تھی۔ سرمایہ دار کو اپنی بالاتر قوت کا پُوری طرح احساس ہو چکا تھا اور وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر سب سے پہلے اپنے مفادات بالکل محفوظ کرنا چاہتا تھا چنانچہ وہ معاشرے سے یہ بات تسلیم کروانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ دوسرے معاشری عناصر کو خواہ فائدہ ہو یا نقصان مگر اُسے سرمایہ کے فراہم کرنے کے لیے ایک لگی بندھی رقم سُود کی صورت میں ہر حال میں ادا کر دی جائے گی۔ یہ اصول چونکہ مسیحیت کی تعلیمات کے بالکل منافی تھا اس لیے پہلے تو اس سُود کی مختلف توجیہات کی گئیں کہ یہ وہ اضافہ نہیں جسے مذہب نے حرام قرار دیا ہے بلکہ یہ دراصل نفع ہی کی ایک قسم ہے لیکن جب اس قسم کے دلائل لوگوں کو مطمئن نہ کر سکے تو یہ کہا جانے لگا کہ مذہب کو کاروبار سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے۔ اس کا تعلق گویا کسی فرد کے مذہبی احساسات سے ہے۔

سیاسی زندگی میں بھی یہی الجھن پیش آئی۔ یورپی ریاستیں داخلی اور خارجی طور پر ایسا طرزِ عمل اور طریقِ کار اختیار کرنا چاہتی تھیں جن سے ان کے باشندے مادی لحاظ سے دوسروں پر تفوق اور برتری حاصل کریں اور دنیا کی کمزور قوموں کو زیادہ سے زیادہ لوٹا جا سکے۔ مگر مسیحی تعلیمات اس راہ میں قدم قدم پر مزاحم ہوتیں۔ چنانچہ پہلے مراحل میں تو انہیں تعبیر کے نام پر توڑ موڑ کر قوم کے مادی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں کی گئیں مگر جب اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوتی نظر نہ آئی تو پھر کھلے طور پر اس بات کا اعلان کر دیا گیا کہ مذہب کو ریاست کے معاملات میں قطعاً دخیل نہ ہونا چاہیے اور مملکت کی تعمیر خالص سیکولر بنیادوں پر کرنا چاہیے۔

سیکولر ریاست کے معنی عام طور پر لوگ یہ لیتے ہیں کہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں اور عوام جس مذہب کی چاہیں پیروی کریں۔ اس معاملے میں انہیں آزادی حاصل ہے۔ مگر یہ سیکولر ریاست کی نامکمل تعریف ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ریاست مذہب کے معاملے میں غیر جانبدار رہے۔ یہ بات صحیح نہیں۔ سیکولر ریاست مذہب کے معاملے میں اپنے خاص عزائم رکھتی ہے اور جو اصول اور مفادات بھی اس سے ٹکرائیں وہ انہیں ختم کرنے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کرتی ہے۔ سیکولر ریاست کا مقصد وحید یہ ہوتا ہے کہ ملک کی پوری اجتماعی زندگی کی اس اصول پر تشکیل کی جائے کہ کسی قانون، ضابطے اور طرزِ عمل کے صحیح ہونے کا واحد معیار یہ ہے کہ وہ مادی نقطۂ نظر سے فائدہ مند ہو اور اس سے قوم اور ملک کو مادی منفعتیں حاصل ہوتی ہوں یا وہ مادی نقصانات سے اپنا دامن بچا سکتی ہو۔ یہ ایک مثبت طرزِ فکر ہے جس کے نتیجے میں مملکت ایک مخصوص طریقِ کار اختیار کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے۔ جس طرح وہ اپنے حفظ و بقا کے لیے عوام کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ امنِ عامہ میں خلل ڈالیں یا توڑ پھوڑ کا سلسلہ جاری رکھیں، بالکل اسی طرح وہ کسی فرد یا گروہ کو ایسے اصول وضع کرنے یا ایسے ضابطوں کی پابندی کرنے کی اجازت بھی نہیں دے سکتی جو اُس کے مخصوص طریقِ کار میں حائل ہوں یا اُس کے مزاج سے مناسبت نہ رکھتے ہوں۔ ایسی ریاست کے اندر مذہب کے صرف وہ ضابطے اور اعمال گوارا کیے جا سکتے ہیں جو اجتماعی زندگی پر کسی طرح بھی اثر انداز نہ ہوتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ کی پوری زندگی خالص الحاد کے سانچوں میں ڈھل کر رہ گئی ہے۔ مذہب اگر ہے تو وہ صرف گرجاؤں میں عبادت تک محدود ہے۔

یورپ میں جو مذہبی سرگرمیاں لوگوں کو نظر آتی ہیں اُن کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کی نوعیت سمجھنے میں قطعاً وقت نہ ہوگی۔ ان کا مقصد زندگی کے اجتماعی معاملات کو نیکی اور خدا ترسی کی بنیاد پر استوار کرنا نہیں بلکہ مملکت اور ریاست کے عزائم کی تکمیل میں اس کی معاونت کرنا ہے۔ یورپ میں مذہب یا تو کسی فرد کے حاسۂ مذہبی کی تسکین کا ایک نہایت بھونڈا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے جس کا تعلق خارج کی کسی چیز سے نہیں بلکہ محض داخلی کیفیات اور قلبی واردات سے ہے یا یہ مملکت کے ہاتھ میں ایک ایسا آلۂ کار ہے جس سے وہ لوگوں کو فریب دیتی اور بوقتِ ضرورت سادہ لوح عوام کو بہکا سکتی ہے۔ دورِ جدید میں ریاست کے

ہاتھوں مذہب کی جو مٹی پلید ہو رہی ہے اُسے اگر آپ جاننے کے خواہشمند ہوں تو رونلڈ ایڈورڈ ریتھ (RONALD EDWARD WREITH) کی کتاب "ترقی پذیر ممالک میں بگاڑ" CORRUPTION IN DEVELOPING COUNTRIES کے ایک باب "مذہب اور بگاڑ" کا مطالعہ کریں۔ اس سے انہیں معلوم ہو گا کہ ان مادیت پرست قوموں میں مذہب کا کیا حشر ہو رہا ہے اور اسے کن ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مذہب جو درحقیقت انسانوں کی رہنمائی کے لیے آیا تھا اب نہایت گھٹیا مقاصد کی تکمیل کا ایک ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔ یہ مشنیری ادارے سب مغربی استعمار کے ایجنٹ ہیں جن سے وہ اپنے استحکام کا کام لیتا ہے۔ کیا مذہب اپنی اس کمزور اور ناکارہ حیثیت میں انسانوں کی رہنمائی کا کوئی فرض انجام دے سکتا ہے ؟

مارکس چونکہ خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہا تھا کہ مذہب کس طرح سرمایہ داروں، سیاست دانوں اور جاگیرداروں کے ہاتھ میں استحصال کا ایک ذریعہ بنا ہوا ہے اس لیے اس نے انسانی زندگی کی تعمیر نو کے لیے جو نیا نقشہ پیش کیا اس میں مذہب کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ اس کا خیال یہ ہے کہ جب انسانی افکار و اعمال کا سرچشمہ مادیت ہے اور مادی فلاح و بہبود ہی انسان کی معراج ہے تو پھر اخلاق اور مذہب کی باتیں محض بیکار کی زنجیریں ہیں جنہیں توڑے بغیر انسان ترقی کے راستے پر گامزن نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ جب روس میں اشتراکی انقلاب آیا تو سب سے پہلے مذہب کو ختم کیا گیا اور ہر اُس شخص کو چُن چُن کر ہلاک کیا گیا جو اس سے کوئی معمولی سا تعلق بھی رکھتا تھا۔ اس ملک میں اشتراکیت کے علمبرداروں نے اس اطمینان کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کیا کہ اب کوئی دینی ضابطہ یا مذہبی احساس مادیت کے اپنانے یا اُسے اپنی زندگی کا رہنما اصول بنانے میں ان کے راستے میں حائل نہ ہو گا۔

مذہب کا تو بلاشبہ خاتمہ کر دیا گیا مگر حاسۂ مذہبی جو انسان کی فطرت میں پیوست ہے اُس کا قلع قمع کرنا اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر جب عوام کو خوشدلی کے ساتھ جنگ کی آگ میں جھونکنا مقصود تھا تو پھر عوامی احساسات کی رعایت رکھتے ہوئے چند مساجد اور گرجے واگزار کر دیئے گئے کہ لوگ

اپنے مذہبی احساس کی کسی حد تک تسکین کر سکیں اور بیرونِ ملک دنیا کی مذہب پسند قوموں کو دھوکا دے کر اس فیصلہ کن مرحلے پر اپنے ساتھ ملایا جاسکے۔ سرمایہ داری کی طرح یہاں بھی مذہب سے صرف یہی دو کام لیے گئے اور اس مذہب کو لوگوں کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی پر قطعاً اثر انداز نہ ہونے دیا گیا۔

چین نے روس کے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پہلے مذہب سے براہِ راست تعارض کرنے سے گریز کیا۔ چونکہ اس کا میدانِ کار ایشیا ہے جہاں لوگ یورپ کی نسبت مذہب سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اس لیے چین کے اشتراکیوں نے یہی بہتر سمجھا کہ مذہب کا براہِ راست گلا گھونٹنے کی بجائے ایسی فضا تیار کی جائے کہ مذہب خود بخود دم توڑ دے اور اشتراکیوں کے ہاتھ اس کے خون سے رنگنے نہ پائیں۔ چنانچہ چینی اشتراکیوں نے پہلے تو سرمایہ دارانہ نظام کی طرح اجتماعی دباؤ ڈال کر بالواسطہ طریقوں سے مذہب کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی مگر جلد ہی انہوں نے اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ اہلِ چین کی اجتماعی زندگی کو خالص مادی بنیادوں پر اس وقت تک کامیابی کے ساتھ اٹھایا نہیں جاسکتا جب تک کہ ان ساری اقدار کو بالکل ملیامیٹ نہ کر دیا جائے جن کا سرچشمہ اخلاق اور روحانیت ہے۔ نیز انہیں اس امر کا بھی احساس ہوا کہ جس تیزی اور سرعت کے ساتھ وہ اپنی زندگی کو خالص مادیت کی بنیاد پر استوار کرنے کا عزم رکھتے ہیں اسی تیزی اور سرعت کے ساتھ مذہب ختم نہیں ہو رہا۔ خصوصاً مسلمانوں میں اس کے خاتمے کی رفتار بہت سست ہے۔ اسی وجہ سے چینی ثقافتی انقلاب کے داعیوں نے مسلمانوں کو دو ٹوک الفاظ میں متنبہ کر دیا ہے کہ انہیں اپنے ان سارے اصولوں اور ضابطوں کو پس پشت ڈال دینا اور ان ساری تعلیمات سے مُونہہ موڑ لینا چاہیے جو مادی محرکات کو انسانی افکار و اعمال کی بنیاد بنانے کے بجائے اخلاقی اور روحانی محرکات کو بنیاد بنانے کی تلقین کرتی ہیں۔ اب ان سے یہ چاہا جا رہا ہے کہ وہ اپنے دین اور ایمان کا اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ کر پوری یکسوئی کے ساتھ اشتراکیت کی منزل کی طرف بڑھیں۔

اس طرح سے اس وقت مسلمان بحیثیتِ مجموعی مادیت کی دوگونہ یلغار کا سامنا کر رہے ہیں۔ جو مسلمان اشتراکیت کے زیرِ سایہ رہنے پر مجبور ہیں انہیں مذہب کو ترک کرنے کا براہِ راست چیلنج دیا جا رہا ہے اور جو

سرمایہ دارانہ ممالک کے سیاسی، معاشی یا تہذیبی تسلط کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں اُن کے لیے ایسے ناسازگار حالات پیدا کیے جا رہے ہیں کہ مذہب کی پیروی اُن کے لیے کسی طرح ممکن نہ رہے اور وہ بھی مغرب کی تقلید میں اپنی زندگی خالص مادہ پرستانہ بنیادوں پہ استوار کریں اور مذہب کو رہنمائی کے مقام سے ہٹا کر اُس پست مقام پہ لے آئیں جہاں اُسے مادی مقاصد اور عزائم کے حصول کے لیے بطور آلۂ کار استعمال کیا جا سکے۔ زندگی کے کسی اہم شعبے میں اس کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔

سر سید سے لے کر آج تک کے متجددین کی تحریروں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں بھی تعبیر کے نام پہ اسلامی تعلیمات کے ساتھ ایک ایسا شرمناک کھیل کھیلا جا رہا ہے جو اصلاحِ مذہب کی آڑ میں اہلِ یورپ نے مسیحیت کے ساتھ کھیلا تھا۔ کسی مسئلہ کی تعبیر و توضیع کوئی ایسا غلط کام نہیں جس کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہ ہو۔ اگر یہ نیک نیتی اور ذہنی مرعوبیت کے بغیر دین کے پورے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے کی جائے تو یہ ایک دینی خدمت ہے لیکن اگر اس تعبیر کے پس پردہ یہ جذبہ کارفرما ہو کہ کسی طرح دینی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر انہیں عہد حاضر کے غالب نظریات کے مطابق بنا دیا جائے تو یہ انتہائی بددیانتی اور مذہب کے ساتھ غداری ہے جس سے کسی مسلمان کو اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو یہاں بھی مذہب کا وہی حشر ہوگا جو یورپ اور چین اور روس میں ہو رہا ہے۔

یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ اس وقت مسلمان ممالک میں جو لوگ اقتدار کے تخت پر مسلط ہیں وہ اپنے سامنے ملی فلاح و کامرانی کا وہی تصور رکھتے ہیں جو مادیت کی علمبردار قوموں کے ہاں پایا جاتا ہے۔ یہ حضرات بھی اپنے اپنے ملک میں اجتماعی زندگی کی تعمیر خالص مادی بنیادوں پہ کرنا چاہتے ہیں اور اس بنا پر مادی محرکات کو قوم کے فکر و عمل کی اساس بنانے کے متمنی ہیں مگر وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ قوم ایک ایسے نظام حیات سے وابستگی رکھتی ہے جس کے اصول اور ضابطے اس راہ میں حائل ہوتے ہیں تو پھر وہ مختلف طریقوں سے انہیں غیر مؤثر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے لیے حجت صرف قرآنِ مجید ہے اور جس صادق و مصدوق پر یہ

قرآن نازل ہوا اس کی تصریحات اپنے دَور کے لیے تو حجت تھیں مگر ہمارے لیے حجت نہیں۔ اس طریق سے قرآن مجید کی من مانی تاویلات کے لیے راستے کھولے جاتے ہیں۔ پھر ذرا ایک قدم اور بڑھایا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید کے چند اصول (اب اُن کی صراحت یہ کی جا رہی ہے کہ توحید اور انسانی مساوات) تو ہر دَور کے لیے صحیح ہیں مگر کتاب الٰہی میں معاشرتی، سیاسی اور معاشی زندگی کے لیے جو ضابطے موجود ہیں اُن میں حالات کے تحت مناسب تغیرات کیے جا سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آج سے چودہ سو برس پہلے کے قوانین کو دَورِ جدید میں نافذ کر دیا جائے۔ ہمارے دَور کے اپنے تقاضے ہیں جنہیں ہمیں خود اپنی عقل سے پورا کرنا چاہیے۔ اور جس عقل کو رہنما بنایا جا رہا ہے یہ وہی عقل ہے جس کی بنیاد محسوسات، تجربات اور مشاہدات پر رکھی گئی ہے اور جس نے یورپ کو خالص الحاد کی راہ پر ڈال دیا تھا۔

ہمارے ہاں اسلامی تعلیمات کی جو نت نئی تاویلات ہوتی رہتی ہیں وہ اس بات کی شہادت فراہم کرتی ہیں کہ ہماری اجتماعی زندگی کی بنیادیں ہلائی جا رہی ہیں اور اُس کی اخلاقی اور روحانی اساس کو مسمار کر کے اُسے مغرب کی تقلید میں خالص مادی بنیادوں پر تعمیر کیا جا رہا ہے۔ فتنۂ انکارِ حدیث، عائلی قوانین، خاندانی منصوبہ بندی، ثقافت کے نام پر ناچ گانے کا فروغ، مردوں اور عورتوں کی مخلوط مجالس، معاشی زندگی میں سُود کا غیر معمولی عمل دخل اور بے حجابی کا بڑھتا ہوا طوفان یہ سب وہ علامات ہیں جو ہماری ملی اساس کے اندر تبدیلی کی نہایت کھلے طور پر نشاندہی کر رہی ہیں۔ جب ان تاویلات کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے تو بڑی معصومیت کے ساتھ یہ کہا جاتا ہے کہ دین کسی فرد یا گروہ کی اجارہ داری نہیں ہے۔ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس میں غور کر کے اپنے نتائجِ فکر سے لوگوں کو روشناس کرے۔ ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ دین کسی فرد یا گروہ کی میراث نہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ دین میں غور و خوض کر کے تفصیلات مرتب کرنے کا ہر اُس مسلمان کو اختیار ہے جو اس کی قابلیت اور استعداد رکھتا ہے۔ اس مقدس کام کو کسی خاص گروہ یا طبقے تک محدود نہیں کیا جا سکتا، مگر اس بنیادی حقیقت کو بھی تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دین کی کسی تعلیم اور اس کے کسی اصول کی وہی تعبیر اور توضیح قبول کی جا سکتی ہے جو اس کے مزاج سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہو۔ آخر ایک

مسلمان اپنے ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے یہ بات کس طرح باور کر سکتا ہے کہ قرآن مجید کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی احکام ایک مخصوص دور کے لیے توصیح تھے مگر آج کل کے لیے ناقابلِ عمل ہیں، وہ اس بات کو آخر کس طرح ماننے پر تیار ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات صرف اُن کی حیاتِ طیبہ میں برحق تھیں اور اب وہ ہمارے لیے حجت نہیں ہو سکتیں۔ اُس کا دماغ احکامِ الٰہی کی ایسی مضحکہ خیز تاویلات کس طرح قبول کر سکتا ہے کہ خنزیر کی چربی اور اس کے بال تو استعمال کیے جا سکتے ہیں کیونکہ قرآن مجید نے صرف اس کے گوشت کو حرام ٹھیرایا ہے یا مغرب میں مشینوں سے کٹے ہوئے جانوروں کا گوشت اس لیے جائز ہے کہ اسلام نے اہلِ کتاب کے ذبیحہ کے کھانے کی اجازت دی ہے۔ اس قسم کی تاویلات بلکہ تحریفات نہ تو کسی مسلمان کے ذہن کو اپیل کر سکتی ہیں اور نہ امت کا اجتماعی ضمیر انہیں گوارا کر سکتا ہے۔ ایک اَن پڑھ سے اَن پڑھ مسلمان بھی جو معمولی سی دینی حس بھی رکھتا ہے وہ بادنیٰ تامل یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس قسم کی خرافات دین کے مزاج کے بالکل منافی ہیں اور ان سے دین کو تقویت پہنچنے کی بجائے اس کا حلیہ بگڑتا ہے۔

اس قسم کی فضول باتیں کرنے والوں نے شاید یہ سمجھ رکھا ہے کہ مسلم قوم ایک اخلاقی اور روحانی خلا کے اندر صدیوں سے زندہ چلی آرہی ہے۔ اُس کے قلب و دماغ پر مذہبی تعلیمات کا کوئی نقش سرے سے موجود نہیں۔ اُس کے ضمیر کے اندر مذہبی احساس کی کوئی رمق نہیں، اُسے عقل، قومی مفاد اور عصری تقاضوں کے نام پر جس چیز کی دعوت دی جائے گی وہ اس پر لبیک کہے گی۔ یہ ایک زبردست غلطی ہے جس میں مغربی قومیں اور اس ملت کا مغرب زدہ طبقہ بُری طرح گرفتار ہیں۔ مسلمانوں کا اسلام سے خواہ جذباتی تعلق ہی سہی مگر وہ اسے آج بھی اپنی فلاح و کامرانی کا واحد ذریعہ تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اس کی تعلیمات سے پُوری طرح واقف نہ سہی مگر وہ اس کے مزاج سے تو ضرور آشنا ہیں۔ اُن کے ضمیر نیم مُردہ ہی سہی مگر وہ زندگی کی اس قدر توانائی تو رکھتے ہیں کہ اس بات کا فیصلہ کر سکیں کہ کون سی تاویل و تعبیر اسلام کے اساسی تصورات سے متصادم ہے۔

جس قوم کے اندر مذہبی روایات رچی بسی ہوں اُس کی اساس کو اس قسم کی بھونڈی تاویلات سے بدلنا ناممکن ہے۔ مغرب میں اگر یہ تجربات کامیاب ہوئے تو اُس کی دوسری وجوہ ہیں مگر ہمارے ہاں گذشتہ دوسو سال سے یہ کوششیں ہو رہی ہیں اور ان کوششوں کے کرنے والوں میں بڑے بڑے سیاست دان،

اصحابِ اقتدار اور اہلِ علم شامل رہے ہیں مگر ان کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ اس کے علاوہ برآمد نہیں ہوا کہ قوم ذہنی انتشار کا شکار ہوتی چلی گئی۔ ایک طرف اس کی حیاتِ اجتماعی کی مذہبی بنیادوں کو ان کم عقلوں نے متزلزل کر کے رکھ دیا اور دوسری طرف قوم مادی بنیادوں پہ اپنی حیاتِ اجتماعی تعمیر کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کی ساری صلاحیتیں باہمی کشمکش اور سر پھٹول میں ضائع ہو رہی ہیں۔ خدا کرے کہ اس قوم کے سربراہ اس کے مزاج کو ٹھیک طور پر سمجھ کر اس کے فلاح و بقا کی کوئی صحیح راہ متعین کر سکیں۔ اور جو قومی صلاحیتیں خلل کشمکش میں ضائع ہو رہی ہیں وہی صلاحیتیں تعمیر و ترقی میں صرف ہوں۔

مغرب کی مادی ترقی جس نے مسلم قوم کے برسرِ اقتدار طبقوں کی آنکھوں کو ہی خیرہ نہیں کیا بلکہ ان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو بھی سلب کر لیا ہے، انسانیت کے لیے سراپا رحمت ہی نہیں، اس کے تاریک پہلو بھی اب لوگوں کے سامنے کھل کر آگئے ہیں۔ ان کی طرف سے آنکھیں بند کر کے ملت کو قوت و طاقت سے ان راہوں پر گھسیٹنے کے لیے تگ و دو کرنا جن کے خطرناک انجام ہم دیکھ رہے ہیں، کوئی دانشمندی اور حقیقت پسندی نہیں یہ بالکل ایک بے جا ضد ہے جس سے کبھی کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ دوسری اقوام کے فنی کمالات اور علمی انکشافات سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ آپ ان سے پوری طرح استفادہ کریں حکمت اور دانائی کی ہر بات مومن کی گم شدہ متاع ہے۔ اُسے قبول کرنے میں کبھی تامل نہ کرنا چاہیے۔ مگر یہ ذہن نشین رہے کہ ہر فرد اور ہر قوم کی ہر بات حکمت و دانائی کی بات نہیں ہو سکتی۔ بعض قومیں بھی افراد کی طرح بڑی نامعقول باتیں کرتی ہیں مگر اپنی حماقت سے انہیں حکمت اور دانائی کی باتیں سمجھ بیٹھتی ہیں۔ اس لیے انہیں اپنانے میں پورے حزم و احتیاط کا ثبوت دینا چاہیے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ہم غیروں کی حکمت کو اپنانے اور اُس سے فائدہ اٹھانے میں مصروف رہیں اور یہ "حکمت" اندر ہی اندر ہماری ملی اساس کو کھوکھلا کرتی چلی جائے۔ حکمت اور دانائی وہی مفید ہے جو ہمارے نظامِ حیات سے پوری طرح مناسبت رکھتی ہو اور اس طرح اسے قوت و طاقت فراہم کرنے والی ہو۔ (باقی ص ۶۳ پر)